AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com

Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

جدید اردو ناول میں تعلیمی شعور کا اظہار: اجمالی جائزہ

آسیہ محمد اشرف

پی ایچ۔ڈی اُردو (سکالر)

ڈویژن آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

Asia Muhammad Ashraf

Ph.D Urdu (Scholar)

Division of Islamic & Oriental Learning,

University of Education, Lower Mall Campus, Lahore

Abstract:

This study examines how modern Urdu novels portray educational consciousness, highlighting its role in shaping critical thinking and societal transformation. Starting from Deputy Nazir Ahmad's Mirat-ul-Uroos, which laid the foundation for educational themes in Urdu fiction, contemporary novelists have expanded the discourse by addressing educational challenges, institutional flaws, and social inequalities. Dr. Shahid Siddiqui's Aadhe Adhoore Khwab critiques rote learning and promotes student-centered education. Dr. Maqbool Nisar Malik's University explores the commercialization of higher education. Muhammad Hameed Shahid's Mitti Aadmi Khaati Hai emphasizes education's role in self-awareness. Asghar Nadeem Syed's Tooti Hui Tanab Udhar critiques the colonial dual education system, while Akhtar Raza Saleemi's Jandar symbolizes the clash between tradition and modern education. These novels depict education not just as academic learning but as a transformative force shaping individual and collective identities. By integrating educational themes, Urdu novelists contribute to a broader discourse on literacy, critical thinking, and social progress in Pakistan.

KeyWords: Modern, Consciousness, Urdu Novel, Society, Education, Life, Contemporary, Educational Institute, Teacher, Student

کلیدی الفاظ: جدید، شعور، اُردو ناول، سماج، تعلیم، زندگی، عصری، تعلیمی ادارہ، معلم، متعلم

ناول نثری صنف ادب ہے۔ ناول میں وقت، سماج اور انسانی زندگی کی ترجمانی اس طرح کی جاتی ہے کہ زندگی کی حقیقت اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ عیاں ہو جاتی ہے۔ ناول میں کسی دور کی سچائیوں کو سمونے کے لیے مخصوص حالات اور کرداروں کے ذریعے انسانی زندگی کی عکاسی کی جاتی ہے ناول نثر میں کہانی کی وہ صنف ہے جو عصری زندگی کی سماجی حسیت، تہذیبی شعور اور تمدنی اسباب و عوامل کو تنظیم و تسلسل کے ساتھ فنی اور جمالیاتی طور پر پیش کرتی ہے۔ قمر رئیس نے ناول کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے:

> "اس کا طریقہ کار اور مقصد بھی زندگی اور اس کے حقائق کی فن کارانہ ترجمانی ہے۔ ایسی ترجمانی جو نہ صرف ہمیں لطف و انبساط اور تسکین بخشے بلکہ ہمارے علم و آگہی کی حدوں کو وسیع کر کے زندگی اور فطرت کے اسرار و مسائل کو سمجھنے میں مدد دے۔ انسان اور کائنات کے مابین نئے رشتوں، فرد اور سماج کی بڑھتی ہوئی آویزش کے مکمل اور مؤثر اظہار کے لیے ناول جیسی صنف وجود میں آئی۔"(۱)

تعلیم کے حوالے سے پاکستانی معاشرے کی سوچ ہر ادیب نے اپنے اپنے انداز میں اپنی تحریروں میں بیان کی ہے۔ اگرچہ اس ترقی یافتہ دور میں جہاں دنیا ایک عالمی قصبے کی شکل اختیار کر گئی ہے نت نئی ایجادات ہو رہی ہیں۔ پاکستان میں معاشی اور سیاسی مسائل کے باعث تعلیمی صورت حال غیر تسلی بخش ہے۔

تعلیم انسانی شخصیت کو نہ صرف سنوارتی ہے بلکہ انسانی ذہن پر فکر و نظر کے نئے دریچے بھی وا کرتی ہے۔ تعلیم انسان کے شعور کو سنوارتی ہے۔ تعلیم ہی کسی انسان

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

کو مہذب اور باشعور شہری بناتی ہے۔ تعلیم وہ بنیادی تصور ہے جو اچھائی اور برائی میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ مسلم مفکرین تعلیم کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون کے مطابق:

"تعلیم ہی عرفان ذات، خدا کا عرفان، منشائے حیات اور اس کے بلند تر نصب العین غایت الغایات کا علم ہوتا ہے۔"(۲)

شاہ ولی اللہ ان الفاظ میں تعلیم کی تعریف کرتے ہیں:

"تعلیم کا اولّین مقصد انسان کے فطری ادراک کی تربیت کرنا ہے تاکہ وہ خود شناسی کی منزل سے گزر کر خدا شناسی کی منزل تک پہنچ جائے۔"(۳)

تعلیم وہ عمل ہے جو فرد میں موجود صلاحیتوں کی نہ صرف تلاش کرتی ہے بلکہ اس کی شخصیت اور کردار کی تشکیل و تکمیل بھی کرتی ہے، جس سے وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ بہترین انسان کے طور پر معاشرتی زندگی بسر کر سکے۔ تعلیم ہی کی بدولت ہر معاشرہ اپنی روایات اور اقدار کو استحکام بخشتا ہے۔ تعلیم نہ صرف انسان کو خود شناسی سے روشناس کرتی ہے بلکہ اللہ تعالی کی معرفت سے بھی نوازتی ہے۔ تعلیم نے عوام میں یہ شعور پیدا کیا کہ ہم زمین میں چھپے خزانوں کو بروئے کار لا کر انسانیت کو پہچان سکیں۔ اس کی بدولت ہی ہم جنگلوں کی زندگی کی بجائے شہروں اور قصبوں میں پر سکون زندگی جی رہے ہیں۔

اردو ناول کی روایت کے آغاز ہی سے ہمیں تعلیمی شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اولین ناول نگار "ڈپٹی نذیر احمد" نے اپنے پہلے ناول "مراۃ العروس"(۱۹۶۹ء) کو اپنی بچیوں کی تعلیم و تربیت کی غرض سے تحریر کیا تھا۔ اس ناول کا دوسرا حصہ "بنات النعش"(۱۹۷۲ء) بنیادی تعلیمی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔ اور یہ ناول اردو میں تعلیمی شعور کی سنگ بنیاد بھی ہے۔ اکیسویں صدی کے اردو ناول نے جہاں جدید زندگی کے سماجی مسائل، سائنسی نظریات اور ادبی افکار کو اپنے اندر سمویا ہے وہاں تعلیمی رجحان، نظریات، معیار تعلیم، تعلیمی مسائل، تعلیمی ماحول، تعلیمی انتظامات، تدریسی طریقہ کار، نصابی و ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں، تعلیم و تربیت کے جذبات و احساسات، سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی اداروں کی طرز تفاوت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ افراد کی طرزِ فکر اور طرز عمل پر بھی بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہر ناول نگار نے اپنے منفرد قلم کے زیر اثر موجودہ عہد کی عکاسی کی ہے اور بدلتی ہوئی اقدار و رجحانات اور مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ نئی اقدار کے ساتھ پرانی روایات سے آگاہی بھی پہنچائی ہے۔ دور جدید میں تعلیم کے حصول کے ساتھ شعور اور تربیت پر بھی بات کی ہے۔ تعلیم جہاں زندگی کو سنوارنے اور آرام دہ بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے وہاں عرفان ذات اور دوسروں کا احساس بھی دلاتی ہے۔ موجودہ عہد میں شناخت کا مسئلہ ہر انسان کو درپیش ہے۔ تعلیمی شعور اس سے نہ صرف انسان کو روشناس کراتا ہے بلکہ اس کی تلاش اور تربیت میں بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ انسان کا باشعور ہونا اور تعلیم یافتہ ہونا معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل کا نہ صرف ادراک کر سکتا ہے بلکہ نئی نسلوں تک تعلیم کے ذریعے اس شعور کی منتقلی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اردو ناول میں تعلیمی بصیرت فکر اور تدبر کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے اردو ناول نے جہاں پڑھے لکھے کردار تخلیق کیے وہاں کم تعلیم یافتہ افراد کو بھی اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا ہے۔ اس حوالے سے اکیسویں صدی کے چند ناول قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر شاہد صدیقی کا شمار پاکستان کے ممتاز ماہر تعلیم میں ہوتا ہے۔ انہوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد لسانیات میں پی ایچ ڈی مکمل کی۔ پاکستان کی مختلف جامعات میں تدریسی فرائض احسن طریقے سے نبھائے ہیں۔ وہ مختلف موضوعات پر کالم اور مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا ناول "آدھے ادھورے خواب" تعلیمی ماحول، تعلیمی مسائل اور ضروریات کو بیان کرتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک استاد کا ہے، جو تعلیم کے ذریعے سماجی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ یہ ناول نہ تو رومان سے متعلق ہے نہ ہی اس میں کسی ماورائی مخلوق کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ بل کہ اس ناول میں طالب علموں کے شعور کو اجاگر کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ ان کے ذہنوں میں علم و فکر کے بیج بونے کی غیر محسوس کوشش کی گی ہے۔ اس میں ایک استاد نے دوستانہ انداز میں خیر کے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقصد حیات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ طلبہ کے غور و فکر کرنے اور سوال اٹھانے اس کو پسند کیا گیا ہے۔ معاشرے میں ہونے والی نا اتفاقیوں اور مسائل کو دلچسپ انداز سے کہانی کا حصہ بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے مقصدیت کو مد نظر رکھتے ہوئے طالب علموں کی اصلاح کی ہے، ان کے ذہنوں میں پنپنے والے سوالات اور فکر کو پراگندہ کرنے والے اوہام اور ان کو درپیش معاشرتی، سماجی، اور معاشی مسائل

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

کو ناول کے لبادے میں بیان کیا ہے۔ ناول کو مکالماتی انداز سے تحریر کیا ہے۔ اس ناول کا ہیرو ایک استاد "پروفیسر سہارن رائے" ہے جس کا کل سرمایہ فراست، دانش اور مقصدیت ہے۔ یہ ایک کامل استاد ہے جو اپنی فکر اور عمل سے سماج اور معاشرے میں تبدیلی کے لیے کوشاں ہے۔ اس کا ہر لفظ عمل مقصدیت سے جڑا ہوا ہے۔ وہ طالب علموں کے ساتھ دوستانہ رشتہ استوار کیے ہوئے ہے۔ اور اس وجہ سے طلبہ ان کے ساتھ اپنے سارے معاملات بغیر کسی حجاب کے بیان کر دیتے ہیں۔ اور وہ اپنے مسائل ان سے چھپاتے نہیں ہیں۔ پروفیسر رائے بظاہر اپنے طلبہ کا ساتھ دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی شرارتوں سے حظ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ لیکن پس پردہ وہ اپنے طلبہ کے ذہنوں کو زندگی کی حقیقتوں سے روبرو کرتے ہیں۔ اس ناول کی ہیروئن پروفیسر رائے ہی کی ایک طالبہ انتقال آغا ہے۔ جو پہاڑوں، پھولوں اور وادیوں میں پلی بڑی ہے۔ فطرت سے محبت اور سچائی اس کے وجود کا حصہ ہے۔ کتابیں پڑھنے کی رسیا ہونے کی وجہ سے وہ اچھی تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ پھر ایک دن ان وادیوں، پھولوں اور گھٹاؤں کو خیر باد کہہ کر وہ ایک ایسے شہر میں آجاتی ہے جہاں نہ تاروں بھرا آسمان نہ جھرنوں کا شور اور نہ پرندوں کی چہچاہٹ بلکہ دھوئیں اور شور میں ڈوبا ہوا شہر جہاں ہر کوئی اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔ جہاں بہت سے اساتذہ تعلیم کی گتھیاں اپنے اپنے انداز سے سلجھانے میں مصروف ہیں۔ ایسے میں پروفیسر رائے سے ملاقات انتقال کی زندگی کو نیا رخ عطا کرتی ہے۔ پروفیسر رائے نے اس خود سر لڑکی میں موجود پنہاں صلاحیتوں کو نہ صرف سحر انگیز انداز سے نکھارا بل کہ اس کے ذہن میں موجود بہت سارے ایسے سوالات جو اس کے پنہاں خانوں میں خوابیدہ تھے ان کے جوابات تلاش کرنے میں اس کی مدد کی۔

پروفیسر رائے کی خاص تکنیک تھی کہ وہ اپنے طلبہ کے سامنے ایک سوال رکھ دیتے، اور کلاس میں موجود ہر طالب علم کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہر کوئی اپنی ذہنی اپج کے مطابق سوچتا سمجھتا اور اس کا جواب دینے کی سعی کرتا۔ یہ کوشش ان کے ذہنوں کو وسعت دے کر فکر کی جولانیوں کو بروئے کار لانے پر آمادہ کرتی۔ پروفیسر رائے کی زبان سے شاہد صدیقی نے ایسے الفاظ تحریر کیے جو ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک "علم کا پہلا زینہ اُلجھن ہوتی ہے"۔۔۔ مزید یہ کہ "خواہش اپنا راستہ خود تراشتی ہے۔۔ منزل اپنی راہ کو خود جنم دیتی ہے۔۔۔۔ اور تعبیر اپنا خواب خود چنتی ہے۔"(۴) استاد تعلیمی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی ایک استاد ہے۔ ناول نگار ایک اچھے استاد کی خصوصیات کا بیانیہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

> "ایک اچھا استاد تخلیق کار ہوتا ہے ہر تخلیق ہم سے سوچ کے نئے زاویے مانگتی ہے۔ کائنات کی تفہیم کا جداگانہ انداز چاہتی ہے۔"(۵)

اس ناول کے بارے میں آصف فرخی اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "ایک ماہر تعلیم نے اپنی علمی مہارت میں گوند کر اس ناول کا خمیر اٹھایا ہے۔ ہمارے ہاں علم و ادب کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے اب اس درجے پر پہنچ چکے ہیں، کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں ملنے پاتی۔ ایسی دولخت صورتحال میں شاہد صدیقی کا یہ ناول، علم سے ادب کی طرف قدم بڑھاتا ہوا نظر آتا ہے اور اس لیے مجھے خاص طور پر خوش آئندہ معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کی وہ حقیقتیں جو اپنی گرہ کشائی کے لیے غور و فکر کی متقاضی ہیں، ان کو ہم صرف سیاسی و سماجی تجزیے سے پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکتے۔ ان حقیقتوں کو جسم میں دوڑتے خون کی طرح محسوس کرنے کے لیے ناول ہی کا سہارا بہتر ہے۔ اور اس ناول میں فکر و احساس کی یہ آمیزش زندگی کی حرارت سے جی اٹھتی ہے۔"(۶)

ایسے انداز سے علم اگر طالب علموں کے ذہنوں میں بھر دیا جائے، تو وہ زندگی گزارنے میں کسی کے محتاج نہ ہوں گے۔ اس ناول میں شاہد صدیقی نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ بہترین استاد وہ نہیں جو طلبہ کو طوطے کی طرح علم رٹوائے یا ان کے ذہنوں میں تعلیم کو ٹھونسے بلکہ بہترین گریڈوں تک محدود کرنے کی بجائے ان کو اچھا انسان بنانے، ان کے دلوں اور ذہنوں کو پراگندہ ہونے سے بچانے کے لیے اختصاص سے دستک دینے میں معاون ہو۔ طلبہ اپنے استاد سے سوشل سائنس، سماجیات اور عمرانیات غرض ہر شے کے بارے میں ان سے بحث و مباحثہ کر سکیں۔

پروفیسر سہارن رائے کی فکر کا انداز اس اقتباس میں اپنا عکس پیش کرتا ہے کہ:

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

"میرے کالج کے ابتدائی دن یادگار تھے۔ ٹیچنگ میرا محبوب پروفیشن ہے۔ میں اسے ایک تخلیقی کام سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے طلبہ بہترین منصف ہوتے ہیں۔ وہ جلد ہی استاد کا جائزہ لے کر ایک نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ایک استاد کی شہرت کلاس روم سے جنم لیتی ہے، اور دنوں میں یہ شہرت دوسرے طالب علموں سے ہوتی ہوئی کالج کے برآمدوں، ہاسٹلوں اور کیفے ٹریا میں پھیل جاتی ہے۔"(۷)

پروفیسر رائے ظروف سازی کے بارے میں اپنے شاگردوں کو بتاتے ہیں، کہ کیسے عام سے برتن کو آرٹ کا نمونہ بنادیا جاتا ہے۔ Pottery یعنی ظروف سازی بھی پڑھانے کی طرح ہوتی ہے، جس میں شاگردوں کو آرٹ کا عمدہ نمونہ اساتذہ بناتے ہیں۔ اور طلبہ ان کی تخلیقات کا پرتو ہوتے ہیں۔ سر رائے بتاتے ہیں کہ ہر برتن کو بنانے کے لیے ظروف ساز تین قانون کے مطابق اپنا کام کرتا ہے۔ ڈاکٹر صغر اصدف شاہد صدیقی کے ناول "آدھے ادھورے خواب" کے بارے میں لکھتی ہے۔

"ڈاکٹر شاہد صدیقی نے باقاعدہ مقصدیت کو مد نظر رکھتے ہوئے طالب علموں کی اصلاح، ان کے ذہنوں میں کلبلانے والے سوالات، ان کی فکر کو پراگندہ کرنے والے وہم اور ان کو درپیش سماجی، معاشی، اور معاشرتی مسائل کو کہانی کا روپ دیا ہے۔"(۸)

ڈاکٹر بی بی امینہ اس ناول کے بارے میں لکھتی ہیں۔

"ناول "آدھے ادھورے خواب" کوئی روایتی رومانوی ناول نہیں، بلکہ تعلیم کے ذریعے معاشرتی تبدیلی کا بیانیہ ہے۔ یہ ایک خواب ہے جسے ایک استاد پروفیسر سہارن رائے کی آنکھوں سے دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔ ناول میں کہیں آغاز و انجام نہیں بلکہ ایک تسلسل ہے۔ کہانی کا ہر باب استاد پروفیسر رائے اس کے طریقہ تدریس، رویے اور تصورات کے گرد گھومتا ہے۔ جن کے مطابق ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ معاشی عدم مساوات ہے، اور اس کے حل کے لیے ضروری ہے تعلیمی اور معاشرتی اداروں میں روابط قائم کیے جائیں، نیز تعلیم کے غیر رسمی ذرائع دریافت کیے جائیں۔''(۹)

اس ناول میں ایک ماہر تعلیم نے کہانی کے ذریعے اپنے خواب، خواہشات اور خوابیدہ صلاحتوں کو اردو فکشن میں گوند کر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے بتایا ہے کہ فلسفہ تعلیم کو علمی و ادبی اداروں اور کانفرنسوں کے علاوہ ناول میں بھی برتا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شاہد صدیقی نے اس ناول میں ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو باآسانی دستیاب ہیں یہ غیر معمولی نہیں ان کے شاگرد انتشال، بینش اور شائلہ اس حقیقی دنیا کی تلاش میں نظر آتے ہیں۔ جہاں عدل و انصاف اور اخوت و رواداری کا راج ہو اور یہی اصل تعلیمی شعور ہوتا ہے۔ اس میں ایک ماہر تعلیم نے فلسفہ تعلیم کو ناول کے ابلاغ میں سمویا ہے۔ واحد متکلم کے صیغے میں ڈاکٹر شاہد صدیقی نے تعلیمی و نفسیاتی ماہر کے جذبات کو اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس ناول کے ذریعے ڈاکٹر شاہد صدیقی نے ہمیں کچھ خوابوں اور امیدوں سے روشناس کرایا ہے۔ وہ تعلیمی و سماجی تبدیلی کے ساتھ ساتھ شخصیت سازی پر بھی توجہ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مقبول نثار ملک جنہوں نے "پربت کی وادی" ناول سے اپنی ادبی زندگی کا اغاز کیا وہ بطور محقق، شاعر اور مزاح نگار کی حثیت سے ادبی دنیا میں معروف ہیں۔ ان کا ناول "یونی ورسٹی" تعلیمی شعور کا عکاس ہے۔

"یونی ورسٹی" ناول دو حصوں میں منقسم ہے۔ ناول کا نام ہی ظاہر کرتا ہے کہ اس میں علم و ادب، تعلیمی ماحول، تعلیمی مسائل اور تعلیمی شعور کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تعلیم جو آدمی کو انسان بناتی ہے تعلیم مہارتوں، رویوں اور علم کی نشو نما کرتی ہے۔ یہ طلبہ کی آزادی فکر، سوچ، تنقیدی اور تخلیقی صلاحتیوں کو ابھارتی اور نکھارتی ہے۔ تعلیم طلبہ کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ نہ صرف علم کا ادراک کریں بلکہ نئی اور مختلف صورتحال میں اس کا اطلاق بھی کریں۔ متذکرہ بالا ناول کو لکھنے کی وجہ اس ناول کے پیش لفظ میں مصنف بتاتے ہیں۔

"کالجز اور جامعات میں طویل تدریسی اور انتظامی فرائض کی بجاآوری کے دوران مجھے متعدد ایسے مشاہدات و تجربات سے

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com

Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

> گزرنا پڑا کہ انہیں عام قارئین تک پہنچانے کی آواز میرے ذہن اور ضمیر سے وقفے وقفے سے اٹھا کرتی تھی لیکن میں نے اس آواز کو اپنی ریٹائرمنٹ تک دبائے رکھا۔ چنانچہ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد اپنی تحریروں کے دائرہ اثر کے محدود ہونے کے باوجود میرے ذہن و ضمیر نے یہ ضروری سمجھا کہ حتی المقدور اپنے ان مشاہدات و تجربات کو وابستگان ادارہ جات، ارباب بست و کشاد اور معلمین کے ساتھ تشنگان علم اور ان کے متوسلین تک پہنچا دوں۔"(١٠)

مصنف نے اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ اس ناول کے سارے کردار حقیقی ہیں۔ جو ان کی آنکھوں دیکھے اور کانوں سنے ہیں اور کئی برس تک وہ ان کے قوت مشاہدہ کا حصہ بنے رہے۔ مصنف نے اس ناول کا آغاز یونیورسٹی میں ہونے والے داخلوں سے کیا جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی میں دل چسپی رکھنے والے طلبہ مختلف پروگرامز میں داخلہ کے خواہش مند ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے امیدوار بھی شامل ہیں جو بہت سارے خواب آنکھوں میں سجائے اس ادارے میں وارد ہوئے تھے۔ مصنف نے اس بات پر بھی طنز کیا ہے کہ پہلے طلبہ جامعات میں علم و آگہی زیادہ سیکھتے تھے۔ اور غور و فکر پر دھیان دیتے تھے۔ مگر اب وقت چوں کہ برق رفتاری سے گزر رہا ہے تو طلبہ علم تو سیکھتے ہیں لیکن ان کا زیادہ دھیان نمبروں گریڈز یا سی جی پی اے پر ہوتا ہے۔ مصنف نے سمسٹر سسٹم کی ڈسپلن کے بارے میں لکھا ہے۔

> "سمسٹر سسٹم میں اساتذہ کے لامحدود اختیارات ہوتے ہیں وہ نصاب ساز ہوتے ہیں معلم ہوتے ہیں پرچہ ساز ہوتے ہیں دوران امتحان نگران ہوتے ہیں ممتحن ہوتے ہیں نگران ممتحن ہوتے ہیں صدر ممتحن ہوتے ہیں سیشنل نمبروں کے مالک ہوتے ہیں پریکٹیکل نمبروں کے مالک ہوتے ہیں گویا خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ، خود رِندِے سبُوکش خود بر سرِ آں کوزہ خریدار بر آمد، بشکست رواں شد۔"(١١)

دور حاضر میں وہ ممالک ثروت مند ہیں جو تعلیم یافتہ افراد کے حامل ہیں اور ہنر مند افرادی قوت سے مالا مال ہیں۔ یہ سرمایہ روایتی سرمایوں مثلاً معدنیات، تیل اور گیس وغیرہ سے زیادہ اہمیت کا حامل اور قیمتی ہے۔ اکیسویں صدی میں ترقی کے لیے تعلیم شرط ہے تعلیم کے شعبے میں سرمایہ کاری کی ضرورت ہے ہمارا تعلیمی نظام پسماندگی کا شکار ہے۔ اس کی بنیادی وجہ حکومتِ وقت کی عدم دلچسپی ہے۔ نصاب میں موجود مواد کا از سر نو جائزہ لینا اور بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور ٹیکنالوجی کو اپنے نصاب کا حصہ بنانا ایک اہم کاوش ہے۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں ناقص تعلیمی پالیسیاں تعلیمی ترقی میں ہمیشہ ہی حائل رہی ہیں۔ تعلیمی پالیسی اگر اچھی بنالی جائے تو اس پر عمل ناگزیر ہو جاتا ہے یونیورسٹیز میں ہونے والے واقعات بھی تعلیمی نشو نما میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ ہماری زیادہ تر آبادی گاؤں، قصبوں اور دیہات سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں عموماً عورتوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مرد اس معاشرے کا کرتا دھرتا ہوتا ہے وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی کے فیصلے کر سکتا ہے۔ جب کہ خواتین اپنے ہر فیصلے اور کام کے حوالے سے مردوں پر انحصار کرتی ہیں۔ اگرچہ اب وقت بدل چکا ہے لیکن پاکستان کے کچھ صوبوں میں تعلیم کی صورت حال تشویش ناک ہے۔ یونیورسٹی ناول کے بارے میں شفیق آصف لکھتے ہیں:

> "یہ ناول اپنے موضوع کی وسعت اور اسلوب کی ندرت کی بدولت اردو ناول نگاری کی روایت و ارتقا میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ جو احباب یونیورسٹی زندگی سے محروم رہے وہ اس کا مطالعہ کریں۔"(١٢)

یونیورسٹی اساتذہ محض درس و تدریس پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ طلبہ کو تحقیقی گُر بھی سکھاتے ہیں۔ ریسرچ پیپرز کی اشاعت اور اس کو لکھنے کا طریقہ کار طلبہ کو سکھاتے ہیں۔ ان کی تربیت کرتے ہیں۔ ادبی سرقہ سے طلبہ کو آگاہ کرتے ہیں۔ جملوں کی بناوٹ اور طرز تحریر کے بارے میں ہر نشست میں طلبہ کی رہنمائی کرتے ہیں۔ تحقیق کا بارِ گراں اساتذہ کے کندھوں پر ہے وہ احسن انداز سے معیاری تحقیق کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی معیاری تحقیق خال خال ہی نظر آتی ہے۔ یونی ورسٹی کی زندگی جہاں اپنے اندر بے شمار رنگ لیے ہوتی ہے وہاں ڈگریوں کی بے ہنگم دوڑ اور ناقص تربیت پہ سوالیہ نشان بھی ہے۔ ڈاکٹر مقبول ثنار نے اپنے ناول میں ان سارے پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اور یونیورسٹی ناول لکھ کر ہی اس کی کارکردگی کو جہاں ستائش کی نگاہ سے دیکھا ہے وہاں منفی پہلوؤں کو نمایاں کر کے درستی کی خواہش بھی کی ہے۔

دور حاضر کے مقبول افسانہ نگار محمد حمید شاہد ناول کی صنف میں بھی اپنی ایک مخصوص شناخت رکھتے ہیں ۔ان کا ناول "مٹی آدم کھاتی ہے"

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ایک شعوری آگہی، علم سے شناسائی اور حقیقی تعلیمی شعور کا مسلم عکاس ہے۔ "مٹی آدم کھاتی ہے" یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ انسان اس حقیقت سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ جہاں انسان مٹی کا پتلا ہے وہیں یہ مٹی اس کی زندگی میں اسے اپنے اوپر زندگی گزارنے دیتی ہے اور مرنے کے بعد اس کو اپنے سینے میں چھپا لیتی ہے۔ موت جس کی ہیبت سے سب ڈرتے ہیں کسی نے اسے لغو تصور کیا، اور کسی نے اسے دنیا کے غموں سے چھٹکارا دینے والی کہا، الغرض ہر کسی نے اپنے اپنے انداز سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

مصنف نے لکھا ہے کہ اسے متذکرہ ناول کا رف مسودہ زلزلہ زدہ حویلی سے ملا۔ اور جب اس نے ان یاداشتوں کا مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پہ پہنچا کہ اس مسودے کو لکھنے والا کوئی پڑھا لکھا ماہر یا ادیب نہ تھا بل کہ کم تعلیم یافتہ انسان تھا جو معمولی نوعیت کی شدبد رکھتا تھا۔ زبان و بیان میں تسلسل نہ تھا۔ اس نے واقعات کو ایسے گڈ مڈ کر دیا کہ ان صفحات کو لفظی لبادہ پہنانے کے لیے مصنف کو خاصا وقت لگا۔ بہر حال وہ کم تعلیم یافتہ تھا یا ناخواندہ ہی تھا پر اپنی بات، گفتگو یا کہانی ٹوٹے پھوٹے انداز میں تحریر کرنے میں کامیاب تھا۔

> "کاغذ کا لمس مجھ پر عجیب طرح کا خمار طاری کر دیتا تھا۔ زرجان کو کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ وہاں ایسی بہت سی کتابیں تھیں۔ میں وقت کاٹنے کو انہیں پڑھتا رہتا۔ شاید ان کہانیوں کا اثر تھا کہ اس متروک آدمی کی غیر مربوط یاداشوں کو کہانی کی صورت لکھنے کا نہ صرف خیال سوجھا، بل کہ اسے لکھنے کا آغاز کر کے خود کو پوری طرح اس آگ میں جھونک چکا ہوں۔"(۱۳)

وہ خود اعتراف کرتا ہے۔ کہ تعلیمی شعور اس میں پنپ رہا تھا۔ اس شعور کی افادیت و اہمیت سے آگاہ تھا۔ وہ اوئل عمری سے تعلیم حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ چوں کہ اس کے والدین بہت غریب تھے اور وہ اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے سے قاصر تھے۔ وہ تو دو وقت کی روٹی کا بندوبست بڑی مشکل سے کرتے۔ ایسے کردار ہمارے معاشرے میں موجود ہیں۔ مصنف نے پاکستان کی تعلیمی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے کردار تخلیق کیے ہیں۔ تعلیمی سہولیات کا فقدان، تعلیمی آگہی کا نہ ہونا اور والدین کا تعلیم سے نابلد ہونا یہ حالات بنیادی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

علم و ادب سے لگاو کے لیے خواندہ ہونا شرط نہیں، البتہ زبان شناسی ضروری امر ہے۔ جذبات و احساسات کی سوجھ بوجھ، لفظوں کا بر محل استعمال اور پڑھے لکھے احباب سے دوستی شخصیت میں نکھار لے آتی ہے۔ حمید شاہد نے اپنے اس ناول میں تعلیم اور تربیت یافتہ افراد کے بارے میں بتایا کہ وہ کاغذات کا پلندہ دیکھ کے اس کو ردی تصور نہیں کر لیتے بل کہ ان صفحات میں کام کی باتیں ہو سکتی ہیں۔ کسی کی آپ بیتی، افسانہ یا کہانی ہو سکتی ہے۔ گو کہ ہر لفظ اپنے پڑھنے والے کو کچھ نہ کچھ سکھاتا ضرور ہے بعض اوقات کچھ نہ ہو تو اس کے ذخیرہ الفاظ میں ہی اضافہ ہو جاتا ہے۔

تعلیمی شعور خود شناسی کا عمل ہے معاشرے کو سنوارنے کے لیے نت نئے انداز تعلیم فراہم کرتی ہے شعور رب سے ملاتا ہے تعلیمی شعور انسان کو خوش اخلاق اور مہذب بناتا ہے۔ یہ شعور دوسروں کا احساس پیدا کرتا ہے اور انسانیت سے روشناس کراتا ہے۔ تعلیم اس قابل بناتی ہے کہ معاشرے کی ترقی میں افراد اہم کردار ادا کر سکیں۔ اس بچے کی تعلیم اگرچہ ادھوری رہ گئی تھی لیکن اس نے اپنے مالک اور اس کے خاندان کی ساری داستان ٹوٹے پھوٹے انداز میں تحریر کر دی تھی۔ اور جب زلزلہ آیا تو وہ ان اوراق کو سینے سے لگائے فرش پہ اوندے منہ لیٹا ہوا ملا۔ وہ اس شدید بھونچال سے پریشان اور بوکھلا کے ان یادداشتوں کو کسی محفوظ مقام پہ منتقل کرنا چاہ رہا تھا لیکن اجل نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی۔

تعلیمی شعور کی پرداخت اگر معاشرے کے افراد میں ہو جائے تو ہر فرد اس کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو سکتا ہے تعلیمی شعور انسانیت کی معراج ہے۔ انسان کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے لیے اور اپنے سماج کے لیے کچھ کر گزرے یہ شعور ہی خود آگاہی سکھاتا ہے۔ آدم مٹی کا بنا ہے اور اسی مٹی کا حصہ ہی بن جاتا ہے۔ علی محمد فرشی اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "محمد حمید شاہد کا زیر نظر مختصر ناول "مٹی آدم کھاتی ہے" موضوعاتی حساسیت، تکنیکی مہارت، بیانیہ ندرت اور تخلیقی اخلاص کی بہ دولت اپنی اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ ناول کے باطن میں ایسی کئی پیچیدگیاں مگر تخلیقی انسلاکات موجود ہیں جو اچھے

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

فن پارے کا خاصہ ہوا کرتے ہیں۔"(۱۴)

حمید شاہد نے اس ناول میں تعلیم کے بارے میں جو رویہ ہمارے معاشرے میں روا رکھا جاتا ہے اس کو بھی اپنے کرداروں کا حصہ بنایا ہے۔ سوشل میڈیا کے ہوتے ہوئے بھی ناول میں خط لکھنے اور پیغام رسائی کی اہمیت اور طریقہ کار پر بھی بات کی گئی ہے۔ اس قدر ترقی یافتہ دور میں رہنے کے باوجود بھی ہمارے کچھ دیہاتی قصبوں، گاؤں یا علاقوں میں آج بھی لوگ تعلیم حاصل کرنے کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ حمید شاہد نے اعجاز و اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس ناول کی کہانی کو پرت در پرت انداز میں تحریر کیا ہے۔ اور ناول کے نتیجے کو قاری پہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ اس سے اپنے مطابق جو چاہے اخذ کر لے۔

اصغر ندیم سید خود بھی مدرس ہیں اور تدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔ ان کی وجہ شہرت اگرچہ اردو ڈرامہ نویسی ہے لیکن انہوں نے شاعری بھی کی اور مختلف ناول بھی لکھے۔ تاریخ اور فلسفہ مصنف کا پسندیدہ مضمون ہے۔ تاریخ اور فلسفے کی چاشنی سے گوندکر انہوں نے تین ناول لکھے۔ ٹوٹی ہوئی طناب ادھر، دشت امکاں اور جہاں آباد کی گلیاں شامل ہیں۔ ان کے ناولوں میں علمی و ادبی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا ناول "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" ناول میں ملتان شہر کی تہذیب و ثقافت کا جہاں ذکر کیا وہاں اس شہر میں موجود بازار حسن اور اس کے قیام پر ایسے بات کی ہے جیسے غلام عباس نے "آنندی" افسانے میں طوائفوں کے گھروں اور رہن سہن پر بات کی ہے بظاہر شرفاء ان سے نفرت کرتے ہیں لیکن انہی لوگوں کی وجہ سے یہ مقامات آباد ہیں۔ متذکرہ بالا ناول میں جہاں مصنف نے واحد متکلم کی زبانی اس شہر اور ایک عہد کی عکاسی کی ہے وہاں تعلیمی شعور، تعلیمی صورتحال اور تعلیم کے بارے میں پاکستانی لوگوں کے رویوں پر کاری ضرب بھی لگائی ہے۔ اپنے ناول "ٹوٹی ہوئی طناب ادھر" کے مرکزی کردار "منشی امام بخش" کو علم دوست اور تاریخ کا رسیا لکھا ہے۔ منشی صاحب چوبارے کے ایک کمرے میں رہائش پذیر ہیں اور کتابوں سے محبت ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ علم و عرفان سے بھرپور یہ کردار اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اصغر ندیم سید جو کہ خود درس و تدریس سے وابستہ ہیں تعلیمی نظام، تعلیمی ماحول اور تعلیمی سہولیات پر وہ گہری نظر رکھتے ہیں۔ بطور مدرس وہ پاکستان کے نظام تعلیم اور نصاب پر بات کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایسے ہی کردار اپنے ناولوں میں تراشے ہیں۔ جس سے ایک پڑھے لکھے شخص کی زندگی اور کم تعلیم یافتہ شخص کی زندگی میں جو تفاوت ہوتی ہے اس کو ناول میں جابجا دیکھا جا سکتا ہے وہ اپنے کردار کو قارئین سے اس طرح متعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "منشی امام بخش چوبارے کے ایک کمرے میں رہتا تھا کمرہ کتابوں سے لبالب بھرا ہوا تھا وہ کتابوں ہی پر سکیڑے سوتا تھا۔ شہر کے پڑھے لکھے جو شہر کی آبادی کے حساب سے اسی فیصد تو ہوں گے کہ پرانا شہر پڑھے لکھوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔"(۱۵)

امام بخش سادہ مزاج انسان ہے اس کو لائبریری میں رہنے اور تاریخ جاننے سے شغف تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے کا اس قدر شوقین تھا کہ اگر اس کو کوئی کتاب، ناول سستے بازاری کاغذوں پر چھپا ہوا ملتا تو وہ بھی پڑھ لیتا۔ مصنف نے اس بات پر ضرب لگائی ہے کہ آج کل پڑھنے لکھنے والے برینڈ کے نام پر بھروسہ کرتے ہیں اور وہ اس کتاب کا مطالعہ کرنا پسند کرتے ہیں جو شہرت کا درجہ رکھتی ہو۔ جب کہ اصغر ندیم سید کا کردار امام بخش اس بات کا دھیان رکھے بنا جو کتاب ملتی اس کا مطالعہ کر لیتا۔ وہ تاریخ کے ساتھ ساتھ اردو ناول پڑھنے کا بھی شوقین ہوتا ہے چونکہ وہ پڑھنے لکھنے میں سارا وقت گزار دیتا ہے اس لیے جب کبھی وہ چوراہے پر بیٹھ کے لوگوں سے ہم کلام ہوتا تو لوگ اس کی بات توجہ سے سنتے اور اس طرح اسے ایک اچھے داستان گو کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ اس ناول میں "حاجی ایک منٹ ذرا" کے کردار کو بھی مصنف نے تخلیق کیا ہے۔ یہ کردار معاشرے میں خاص کر سکول کے ارد گرد معصوم بچوں کو اپنے ناجائز کاموں کا شکار بناتا ہے وہ بچے جو گھر سے حصول تعلیم کے لیے آتے ان کے ساتھ عیاش پرست اور منفی سرگرمیوں میں ملوث افراد جو ناروا سلوک کرتے اس کو بھی بیان کیا ہے۔ یہ پاکستانی تعلیمی نظام کا المیہ ہے کہ غریب والدین خود تو محنت مزدوری کرنے کے لیے کام پہ چلے جاتے ہیں لیکن ان کے بچوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ خاص کر تعلیمی اداروں کے ارد گرد ایسے مشتبہ افراد کا داخلہ ممنوع قرار دینا چاہیے۔ لیکن اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ اس کی وجہ سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں بچے بنیادی تعلیم (پرائمری) بھی مکمل نہیں کر پاتے۔ ناول میں اصغر ندیم سید نے اردو ادب کے بہت سارے ادیبوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جیسے قلی قطب شاہ، مرزا ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر، غلام عباس، منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو، انتظار حسین، خوشونت سنگھ، ساحر لدھیانوی، جوش ملیح آبادی، علامہ محمد اقبال اور فیض احمد فیض شامل ہیں۔ مصنف نے قصہ در قصہ کی تکنیک سے جہاں ملتان شہر کی تہذیب، روایات اور تبدیلی پر بات کی ہے۔ وہیں طوائفوں کی زندگی اور کوٹھوں کو آباد کرنے والے

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

لوگوں پر بحث بھی کی ہے۔ ان جگہوں کو آباد کرنے والے احباب پر طنز بھی کیا ہے۔ اور صحرائی زندگی کی رنگینیوں کو بھی موضوع سخن بنایا ہے ان سب کے ساتھ ساتھ مصنف نے واحد متکلم کردار جو پڑھنے لکھنے اور تاریخ کا رسیا ہوتا ہے، اس کی زندگی کتابوں سے بڑے کمرے میں جس کسمپرسی میں گزر رہی ہو اس کو بھی بیان کیا ہے۔ کتاب سے محبت کرنے والے اور اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے لوگوں کی زندگی جن حالات میں گزرتی ہے ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ان کا رہن سہن ناخواندہ افراد سے کس قدر مختلف ہوتا ہے مصنف نے اس بات کو بخوبی بیان کیا ہے۔ مذکورہ ناول میں مصنف نے چند سطریں اس قدر دل کش تحریر کی ہیں کہ قاری کی آنکھیں جب تحریر کا مطالعہ کرتی ہیں تو وہ مصنف کو داد دیے بنا نہیں رہتیں۔ مصنف چوں کہ خود درس و تدریس سے منسلک رہے اس لیے ان کی ہر بات میں علمی پہلو عیاں ہوتا ہے۔

"قلم مزدور ضرور ہے بس شاعری کا پیشہ کرتا ہے۔"(۱۶)

"امام بخش یہ سب کچھ پڑھ لیتا اور اپنے اندر خون میں گھول لیتا تھا پھر اس کے خون میں سے حرکت کرتی کہانیاں باہر آجاتی تھیں۔"(۱۷)

اس دور میں گھروں میں کتابیں ہوتی تھیں اور افراد پڑھنے لکھنے کا شغف رکھتے تھے۔ امام بخش اپنی لائبریری میں رات کو کتابوں سے گفتگو کرتا۔ مصنف نے انگریزوں کے نظام تعلیم پر بھی بات کی ہے کہ انہوں نے اس دور میں جو قانون روا رکھا تھا وہ تعلیم کے سلسلے میں آج بھی رائج ہے۔ بغیر تعلیم دیکھے اپنی پسند کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدوں سے نوازنا۔ دوہرا نظام تعلیم جس سے حاکم اور غلام پیدا کرنے کے لیے الگ الگ نصاب اور من پسند ادارے قائم کیے۔ آج بھی پاکستان میں اشرافیہ کے بچوں کا نظام تعلیم، تعلیمی سہولتیں، نصاب اور ادارے حاکموں جیسے ہیں۔ جب کہ عام رعایا کے لیے بنیادی سہولتوں کا نہ صرف فقدان ہے بل کہ نصاب، طریقہ تدریس، اساتذہ اور ادارے برائے نام ہیں۔ مصنف نے واحد متکلم کی زبانی دوہرا نظام تعلیم جو پاکستان میں آج بھی رائج ہے اس پر کاری ضرب لگائی ہے اور یہاں تک سچائی کو سفاکی سے لکھ دیا ہے کہ انگریزوں نے اپنے دور میں کون کون سے ادارے کس کس مقصد کے لیے بنائے اور ان مقاصد کو آج بھی وہ کس طرح پورا کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"تعلیم کا نظام تو انگریز کے ہاتھ میں تھا وہ لاہور، دلی او بمبئی کے ساتھ کلکتہ میں ایسے کالج کھول چکے تھے جو حاکم اور غلام پیدا کرنے کا الگ الگ نصاب رکھتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اب مجھ سے سنو!

انگریز نے کلکتہ میں یونیورسٹی بنائی اور پھر لاہور میں ایچی سن کالج بنایا۔

بھلا کس لیے؟؟

اس لیے کہ پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کے راجوں کے بچے وہاں آکر حکومت کرنے کے سارے آداب حاصل کریں اور پھر یہ طے ہوا کہ اس کالج سے تربیت کے بعد یہ لاڈلے انگلستان بھیجے جائیں گے۔

اب انگریز نے سوچا اگر حکمران تیار کر لیے تو ان کا دفتری عملہ کون تیار کرے گا۔ اس پر انہوں نے جلدی میں یہ کالج قائم کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور ان کے نزدیک سیکریٹیٹ کے لیے عملہ تیار کرنے کے لیے یہ کالج ضروری تھا۔ اور حویلی دھیان سنگھ میں اس کی کلاسیں شروع ہوئیں اور پھر کیا ہوا؟؟ وہاں سب جانتے ہیں اس کالج نے وہ کام کیا جو گورے نہیں چاہتے تھے وہاں سے غلام نہیں مفکر، شاعر، افسانہ نگار، موسیقار، فلسفی اور نفسیات دان پیدا ہونے لگے۔"(۱۸)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس ناول میں تاریخ کے پردے میں فلسفیانہ انداز میں تعلیمی شعور کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر جو نظام تعلیم آج کل رائج ہے۔ اور جن مقاصد کے لیے انگریز برصغیر پر قابض ہوئے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے تاریخ کی نظر سے اس ناول کی کہانی کی بنت کی گئی ہے۔ مذکورہ ناول مصنف کی اردو ادب اور ادیبوں کے حالات زندگی کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے۔ بل کہ ایک پڑھے لکھے انسان کے زندگی گزارنے کا وتیرہ بھی بیان کیا گیا ہے خواندہ احباب کے دوست بھی ویسے ہی ہوتے ہیں اصغر ندیم سید خود مدرس تھے ان کا تعلق طلبہ، اساتذہ کے ساتھ ساتھ زیادہ کتب بینی سے رہا وہی چیزیں ان کی تحریر کا پرتو ہیں وہ بات بھی تاریخ کے دامن

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

میں لپیٹ کے فلسفیانہ انداز سے کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں مصنف پرت در پرت سے اپنی کہانی کو بیان کرتے ہیں وہ ناول لکھنے کے دوران اپنے ارد گرد کے ماحول سے باخبر رہتے ہیں وہ کہانی بیان کرتے کرتے کئی ذیلی کہانیاں سناتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ اس قدر قوی ہے کہ وہ کتابوں سے محبت اور کتابوں کا نچوڑ اپنی تحریروں میں سموتے نظر آتے ہیں۔ کتاب دوست ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کہانی کہنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ اگر دوران گفتگو علم و ادب کی بات چل نکلے تو نظام تعلیم پر مدلل انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔ پاکستان میں تعلیمی نظام کے تفاوت پہ کڑھتے ہیں اور بے باک انداز سے اپنی کہانی میں تعلیم کے فقدان کا نہ صرف تذکرہ کرتے ہیں بلکہ ان تمام حالات و واقعات کو بھی لکھ دیتے ہیں جن کی وجہ سے تعلیمی ماحول، تعلیمی سہولیات، اور تعلیمی وسائل کا فقدان ہو رہا ہو۔ تعلیمی شعور کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے ہر ایک کو اپنے حصے کا کام کرنا پڑے گا۔ رفاقت حیات اپنی کتاب پاکستان میں اردو ناول ۱۹۴۷ء تا حال) میں ٹوٹی ہوئی طناب ادھر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "نو آبادیاتی نظام تعلیم اور اس کے بعد تیز رفتار سائنسی ترقی اور معاشی ترقی کے اثرات نے جس طرح قدیم اور ٹھہرے ہوئے معاشروں، شہروں اور تمدن کے مراکز پر اپنے اثرات مرتب کیے ٹوٹی ہوئی طناب ادھر انہی اقدار کا احوال بیان کرتا ہے۔"(۱۹)

ملتان شہر کی تہذیب، رہن سہن، اقدار اور رسوم و عقائد کی جھلک بھی ناول میں نظر آتی ہے ٹوٹی ہوئی طناب ادھر میں جہاں مصنف نے اس شہر کے حال احوال لکھے ہیں۔ وہیں تعلیم کا مرکز طوائف کا گھر جو کسی عہد میں علم و ادب کا دوست تھا اس کے کردار پہ بھی بڑی عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ طوائف کا کوٹھا کس طرح آباد ہوا اور کون لوگ ان کوٹھوں کو آباد و ویران کرتے ہیں اس پر تاریخ کے پردے سے روشنی ڈالی ہے۔ تاریخی حوالوں سے کہانی کو فکشن کی بجائے سچ ثابت کرنے کے لیے مصنف نے مختلف احباب کے اقوال سے اپنی کہانی کو معتبر بنایا ہے.

اختر رضا سلیمی شاعر اور ناول نگار کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں جانے جاتے ہیں۔ ان کا ناول "جندر" جہاں مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ ہے۔ اور جندر روئی کی زندگی کی داستان بتاتا ہے۔ وہیں انسان کے ابتدائی دور کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ انسان نے اپنی ابتدا سے اب تک ترقی کی کئی منازل طے کی ہیں۔ وہ تجربات اور غیر رسمی طریقے سے تعلیم سیکھتا گیا اور اپنی زندگی کو پُر آسائش بناتا گیا۔ مصنف کا تعلق پہاڑی علاقے سے ہے۔ اس لیے ان کا ہر ناول اس علاقے کی تہذیب، رسم و رواج، اور اقدار و روایات کا غماز ہوتا ہے۔ آج بھی اس علاقے میں تعلیم حاصل کرنا مشکل ہی ہے۔ تعلیمی ادارے دور دراز ہونے کی وجہ سے تعلیمی شعور کا فقدان ہے۔ لیکن تعلیم حاصل کرنے کا ذوق و شوق آج بھی ماند نہیں پڑا۔ مصنف نے لکھا ہے کہ جب انگریز برصغیر پر قابض تھے تو اس جندر کے پیچھے گھنا جنگل تھا انگریزوں نے اس جنگل میں سے گیارہ فٹ کے قریب چوڑا راستہ ہموار کیا۔ اس راستے سے مختلف ممالک کے طلبہ گزر کر حصول تعلیم کے لیے جایا کرتے تھے۔

> "جندر ایک علامت بن کر آتا ہے جہاں پرانی اشیاء اور اقدار اپنی چمک کھوتے جا رہے ہیں۔ اور ایک نئی نسل ماڈرن ٹیکنالوجی اور سائنس کے ارتقاء کے ساتھ وقت کو نئے معنی پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہم ایک ایسے عہد میں آ گئے ہیں جہاں دھند ہے، تاریکی ہے، مگر خواب زندہ ہیں۔"(۲۰)

مصنف نے بابا جمال الدین کا تذکرہ کیا ہے۔ جو ایک قصہ گو تھا اور کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ وہ تعلیم کی قدر و منزلت سے واقف تھا اور لوگوں کو علم حاصل کرنے اور اس کی افادیت سے آگاہ کیا کرتا تھا۔ وہ اکثر جندر پہ آیا کرتا تھا۔ اور جندر روئی کا دل بہلانے کے لیے اسے قصے کہانیاں سنایا کرتا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ اس جندہ روئی کا بیٹا اس کے پاس کھیل رہا ہے اس نے اس سے کہا کہ اس بچے کو سکول بھیجا کرو اور اس کی تعلیم و تربیت پہ توجہ دو۔ مصنف نے بابا جمال الدین کے کردار کو تخلیق کیا جو عالم و فاضل نہ ہونے کے باوجود تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھا۔ ایسے کردار ہمارے ارد گرد اکثر و بیشتر نظر آتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کرداروں کو اہمیت نہیں دیتے حالانکہ وہ اپنے حصے کا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کی اصلاح اپنی گفتگو اور قصے کہانیوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ ان کی ہر کہانی کے پیچھے ان کا تجربہ اور سبق اموز واقعہ ضرور ہوتا ہے۔

کتاب سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ وہ جندر کی گونج سے مانوس تھا۔ وہ مطالعہ اور نیند کا تصور اس گونج کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا تھا۔ کہ لوگ اس سریلی گونج کے بنا کتابیں پڑھنے کے دوران اپنی توجہ کیسے مرکوز کرتے ہوں گے۔ وہ سوچتا سوچتا اس حد تک چلا جاتا کہ جندر کی آواز کے بنا اس کائنات کے راز کو پایا نہیں جا سکتا۔

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

"مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا ہے کہ گوتم بدھ اگر نروان حاصل کرنے کے لیے برگد کے سائے کی بجائے کسی جندر کا انتخاب کرتا تو بہت کم وقت میں اپنی منزل پالیتا۔ میرے نزدیک ارتکاز توجہ کے لیے اس اسرار بھری کائنات میں گھومتے جندر کی سریلی گونج سے بہتر کوئی چیز نہیں۔"(۲۱)

اس کو مطالعے کی اس قدر عادت پڑی۔ کہ ایک وقت آیا جب بابا جمال دین خود کہانی سنانے کی بجائے اس سے کہانی سننے پہ اسرار کرنے لگا۔ اس کی یاداشت قابل رشک تھی وہ ایک بار کہانی سن کے اس کی جزیات تک یاد کرلیتا۔ میں جب ناول کا مطالعہ کرنے لگتا تو اسے ایک نئی زندگی مل جاتی۔

انہی دنوں اس کی چچازاد ہاجرہ بھی جندر پر آنے لگی اس نے ہائی سکول میں نیا نیا داخلہ لیا تھا۔ ان دنوں ہمارے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج ہی نہیں تھا۔ اور جو لوگ باشعور تھے وہ لڑکیوں کو پرائمری تک بمشکل تعلیم دلواتے اور ہائی سکول اس لیے نہیں بھیجتے تھے کیونکہ وہ گاؤں سے سات میل دور تھا۔ گاؤں کے پاس لڑکوں کا ہائی سکول تھا۔ میرے چچا اس اسکول میں چپڑاسی تھے۔ میری چچازاد اپنی ہم عمر بچوں سے عمر میں بڑی تھی کیونکہ اس نے دیر سے داخلہ لیا تھا۔ اس لیے میرے چچا اسے اپنے ہی سکول میں لے جاتے اس طرح اس دور میں جہاں تعلیم حاصل کرنا مشکل تھا میری چچازاد نے مخلوط تعلیم حاصل کی۔ یعنی چچا کا جو لڑکوں کا سکول تھا۔ ادھر سے دسویں کا امتحان دیا اور وہ ہمارے گاؤں کی پہلی میٹرک پاس لڑکی تھی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد اس کے رشتے بہت آئے لیکن اس نے اپنے ہی گاوں کے سکول میں استانی کی نوکری کرلی اس دور میں میٹرک پاس استاد بھرتی ہو جایا کرتے تھے۔ وہ سارا دن بچوں کو پڑھاتی اور اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ اس طرح اس نے ہمارے گاؤں کی پہلی بی اے پاس خاتون ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ اب وہ ادب کے علاوہ نفسیات، تصوف، سائنس، فلسفہ، تاریخ اور اس نوعیت کے دیگر علوم میں بھی دلچسپی لینے لگی۔ ان علوم سے فائدہ اٹھانے کے بعد اس کا ادبی ذوق اور بھی نکھر گیا۔ بعض اوقات وہ کسی ناول اور افسانے کے کرداروں کا اس طرح تجزیہ کرتی اور ان پہلوؤں پہ بات کرتی جن پہ میں دوران مطالعہ اتنا غور وخوض نہ کرپاتا۔ اس کا تجزیہ سن کے میں رشک کرتا اور حسد میں مبتلا ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کا علم ہوا تو میں بھی ان علوم میں دلچسپی لینے لگا یہ جان کر وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے ان علوم کی بنیادی کتابیں مجھے فراہم کیں۔ انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ ایسا ہی ولی محمد خان کے ساتھ ہوا۔ جب انسان علم دوست اور کتاب دوست بن جاتا ہے تو تنہائی بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ وہ اسے ڈرانے کی بجائے اس کے لیے نعمت بن جاتی ہے۔ میں اپنے ذاتی اخراجات سے پیسے بچا کر ان پیسوں کی کتابیں خریدتا اور دن رات مطالعے میں غرق رہتا۔ شروع میں تو کتابیں تھیلوں میں رکھ دیتا، لیکن جب کتابوں کے ذخیرے میں اضافہ ہوا تو مجھے جندر کے ساتھ چھوٹی سی لائبریری بنانی پڑی۔

اللہ نے اس کو بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ اس کی بیوی نے اپنے بیٹے کو خوب بڑھایا لکھایا۔ اس کا بیٹا اپنے باپ کے پاس آتا اور جب تک اپنے باپ سے پڑھائی کے اخراجات لیتا رہا اس سے اچھے طریقے سے بات کرتا۔ اس کی عزت کرتا اس کے پاس وقت گزارتا۔ لیکن پھر جب وہ بڑا آفیسر بن گیا تو اس کو اپنے باب سے شرم آتی تھی کہ اس کا باپ ایک جندر روئی ہے۔

"یہ کہانی مجھے نسلوں کے درمیان بڑھتے فاصلوں کی کہانی بھی لگی جیسے ماڈرن دنیا جنریشن گیپ کا نام دیتی ہے۔ باپ ساری زندگی خود کو مار کر جس اولاد کو جوان اور عزت کا روزگار کمانے کے لائق بناتا ہے۔ وہی اس کے بوسیدہ کپڑوں، تعلیمی قابلیت، پرانی سوچوں اور اپنے اسلاف کی نشانیوں سے جڑے رہنے کی بدولت باعث توہین سمجھ کر اپنے تئں اس کا بہتر حل نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نادان یہ نہیں سمجھ پاتا کہ انسان انسان کے بنا نہیں رہ سکتا تو وہ اپنے ارد گرد پھیلے قدرتی نظاروں، جھیلوں، دریاؤں، چشموں، پہاڑوں اور یادوں کے بنا کیسے جی سکتا ہے۔"(۲۲)

وہ چاہ کے بھی یہ بات اپنے بیٹے کو نہ بتا سکا کہ وہ اس جندر کی گونج کے بنا سو نہیں سکتا اس کی اواز سنے بغیر اسے سکون نہیں ملتا۔ وہ یہ عادت نہیں چھوڑ سکتا۔ جب اس کا بیٹا اسے اپنے ساتھ شہر لے جانے کے لیے کہتا تو وہ پریشان ہو جاتا۔ اور اپنے دلی جذبات تو کیفیات واحساسات کا اظہار نہ کرپاتا۔ آخر ایک دن اس کے بیٹے نے گاؤں میں بجلی سے چلنے والی چکی لگوادی۔ اب لوگ جندر پر دانے پسوانے کے لیے کم کم جاتے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی آمد ختم ہوگئی۔ جب جندر پہ دانے آنے بند ہوگئے تو اس کی گونج بھی اداسی،

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

درد اور کوک میں بدل گئی۔ اس طرح اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں اس جندر روئی کی وفات ہوئی۔ اس ناول کے بارے میں ایک ادیب نے اپنی رائے اس انداز سے تحریر کی ہے۔

> "جندر روئی کا کتاب کے ساتھ رشتہ بہت پرانا ہے۔ کتابوں کے رشتے نے ہی اسے زندگی کے حقائق سے اس قدر دور رکھا کہ زندگی کے نئے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکنے کے عمل نے اسے ان خوابوں اور خیالوں کی دنیا کا قیدی بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کی گہری وابستگی بچپن اور جوانی میں ان شخصیات سے رہی تھی جنہوں نے اسے کتابوں کی دنیا کی طرف کھینچا تھا۔"(۲۳)

اکثر اوقات انسان کتابی دنیا میں رہنے لگ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے رشتے ناطے نبھانے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اپنے اس سے بد ظن ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ ان کو وضاحت دے لیکن وہ پھر یہ سوچ لیتا ہے کہ یہ میرے جذبات و احساسات کو محسوس کریں۔ ہر انسان کا ادبی ذوق اور مطالعہ اتنا اچھا نہیں ہوتا کہ وہ بنا کہے دوسرے کے احساسات کو محسوس کر سکے۔ اس لیے بعض دفعہ انسان کو اپنا مدعا خود بیان کرنا پڑتا ہے۔ جندر روئی نے اپنی بیوی اور بیٹے کو جندر کی گونج کی وجہ سے کھو دیا۔ اور خود کسم پرسی سے موت کا انتظار کر رہا ہے۔ اور اپنی موت کے ہولناک منظر میں بھی اس کو اپنے بیٹے کے دفتر سے چھٹی کرنے اور کام میں حرج کی پریشانی لاحق ہے۔ والدین بھی عجیب ہوتے ہیں بچوں کی خوشیوں کے لیے خود کو مار دیتے ہیں اور شکوہ بھی نہیں کرتے۔ ایسی ہی کہانی جندر میں مصنف نے بیان کی ہے اور پھر بچے والدین سے کہتے ہیں آپ نے ہمارے لیے کیا ہی کیا ہے؟ کاش وہ اس جندر روئی کی مکالماتی گفتگو پڑھیں کہ پیک اجل کی آمد سے بھی قبل اپنے بیٹے کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے کہ اسے میں کوئی تکلیف نہ پہنچاوں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہر ناول نگار کے ہاں تعلیمی شعور کی جھلکیاں عیاں ہیں۔ تعلیم کی اہمیت، ضرورت اور تعلیمی مسائل کو متذکرہ بالہ ناول نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے۔ تعلیمی شعور انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے ضروری ہے۔ یہ ناول نگار اگرچہ ماہر تعلیم نہیں ہیں، لیکن وہ تعلیمی افکار رکھتے ہیں۔ اور ان افکار کو اپنی کہانیوں میں سمونے کی سعی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولز میں پڑھے لکھے کرداروں اور کم تعلیم یافتہ کرداروں کی زندگیوں میں جو تفاوت ہے اس کو بیان کیا ہے یہ سارے ناول نگار پاکستان سے محبت کرتے ہیں اور آنے والی نسلوں کو تعلیمی افادیت و اہمیت سے روشناس کروانا چاہتے ہیں۔

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www. al-aasar.com
Vol. 2, No. 1 (2025)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

حوالہ جات:

۱۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، تلاش و توازن، دہلی: خرام پبلی کیشنز، ۱۹۶۸ء ص ۱۴۔۱۵

۲۔ ابن خلدون، علامہ، مقدمہ ابن خلدون، اردو مترجم: مولانا راغب رحمانی، حصہ اول، کراچی: نفیس اکیڈمی، طبع یازدہم، ۲۰۰۱ء، ص ۶۹

۳۔ شمیم حیدر ترمذی، ڈاکٹر، اسلام کا نظام تعلیم، لاہور: کاروان ادب، ۲۰۱۳ء، ص ۱۶۵

۴۔ شاہد صدیقی، ڈاکٹر، آدھے ادھورے خواب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵

۵۔ ایضاً ص ۳۸

۶۔ ایضاً، فلیپ

۷۔ ایضاً، ص ۱۱

۸۔ https://jang.com.pk/news/94757

۹۔ https://www.humsub.com.pk/360838/dr-bibi-ameena/

۱۰۔ مقبول نثار، ڈاکٹر، یونیورسٹی۔۔۔۔۔ ۱، فیصل اباد: ماہوا زاپبلی کیشنز، ۲۰۲۳ء ص ۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰

۱۲۔ https://m.facebook.com/story.php?story_fbid=pfbid024ADLgSj2PdV87WfRhymwALBg42qGLK2bqD5Kpep3UtXEnSDXqi9XPLscrpt3nMwpl&id=100007120564540&sfnsn=scwspwa&mibextid=RUbZ1f

۱۳۔ محمد حمید شاہد، مٹی آدم کھاتی ہے، جہلم: بک کارنر جہلم، ۲۰۲۲ء ص ۳۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۱۵۔ اصغر ندیم سید، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۶۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۹۲، ۱۹۱

۱۹۔ رفاقت حیات، پاکستان میں اردو ناول، (۱۹۴۷ تا حال)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۲۲ء، ص ۵۳

۲۰۔ مشرف عالم ذوقی، مضمون ۱۹۸۰ء کے بعد اردو ناول تعارف نئے موضوعات، مشمولہ: "ادبیات" خصوصی ناول نمبر: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء (جلد اول) ص ۵۷

۲۱۔ اختر رضا سلیمی، جندر، راولپنڈی: رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، ص ۴۷

۲۲۔ https://www.humsub.com.pk/340352/waseem-shahid-27

۲۳۔ ڈاکٹر سمیرا اگل، جندر پر ایک نظر، ادراک (شمارہ ۱۷) ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ، ص ۵۷